انتخابِ کلامِ چکبست

ناشر

روپ نرائن شیو پری شاکر





تنویر پریس امین آباد لکھنؤ

ڈوبا ہوا ہوں مثلِ سخن رنگِ سخن میں
گُل ہو کے میں رہتا ہوں لطافت کے چمن میں



اس کو ناقدریٔ عالم کا صلہ کہتے ہیں
مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

ہر سبزہ کہ بر کنار جوئے رُستہ است
گویا ز لب فرشتہ خوئے رُستہ است
پا بر سر سبزہ بخواری نہ نہی
کاں سبزہ ز خاک لالہ روئے رُستہ است

(خسرو)

پنڈت برج نرائن چکبست کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے آپ ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ آپ کے والد پنڈت اُودت نرائن بہار میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور خود بھی شاعر تھے۔ عمر کے دو ہی چار سال گزرے تھے کہ اپنے والدین کے ساتھ لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ لکھنؤ کے بہترین ماحول اور رنگین فضا میں ان کی تعلیم و تربیت شروع ہوئی چونکہ شاعری ورا ثتاً ملی تھی۔ بچپن ہی سے ان کی طبیعت شاعرانہ تھی چھ سات برس کی عمر میں ایک بار اپنی والدہ کے ساتھ مندر گئے جہاں انھوں نے گنیش جی کی تصویر دیکھ کر بے ساختہ کہا "کیا شکل ہے آپ کی آہا ہا"۔ یقیناً ایک موزوں مصرع کہا جا سکتا ہے۔ ۱۹۰۵ء کیننگ کالج لکھنؤ سے بی اے

کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۰۷ء میں ایل ایل بی پاس کر کے وکالت شروع کر دی طبیعت کے اعلیٰ رجحان اور لغوزی علم کے باعث حکبست اپنی ابتدائی عُمر سے ہی نمایاں نظر آتے تھے اور طبعی رجحان کی وجہ سے شروع ہی سے شاعری کے دلدادہ تھے۔ دورانِ تعلیم میں اُس وقت کے نصابِ تعلیم کے موافق منجملہ اور اساتذہ فن کے آتش غالب اور انیس کا کلام ان کے زیر مطالعہ رہ چکا تھا۔ اِن کی فنکارانہ طبیعت نے ان اساتذہ کے طرز کلام کو اپنایا اور ان کے رنگ کو پسند کیا جس کے تمام آثار ان کے کلام میں جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

چونکہ لکھنؤ کے ماحول اور رواج کے بموجب علُوم و فنون تیزی سے حاصل کر رہے تھے۔ ۱۸۹۴ء میں چوتھی سوشل کانفرنس کشمیری منڈال بمقام لکھنؤ منعقد ہوئی اس وقت حکبست کی عُمر تقریباً ۱۲ سال ہی تھی کہ اُنھوں نے اپنی پہلی نظم جلسہ میں پڑھی جس کا مطلع حسب ذیل ہے۔

حُبِ قومی کا زباں پر ان دنوں افسانہ ہے
بادۂ اُلفت سے پُر دل کا مرے پیمانہ ہے

اس مطلع سے پورا پورا اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کی طبیعت میں فطری اور بلا کی ذہانت تھی اور شعر و شاعری کے لیے ایک موزوں طبیعت قدرت نے عطا کی تھی وہ ہی چار سال کے اندر اچھی خاصی مشق حاصل کر لی ذیل میں ان کے کلام

کا کچھ نمونہ جو انھوں نے تقریبًا سولہ سترہ برس کی عمر میں کہا تھا پیش کیا جاتا ہے جس کے پڑھنے کے بعد یہ بغیر کہے نہیں رہا جا سکتا کہ موصوف کو بلا کی قابلیت غضب کی ذہانت اور حد درجہ مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ ملاحظہ ہو ۱۸۹۸ء یعنی سولہ سال کی عمر میں۔

ہاں نورِ ازل جلوۂ گفتار دکھاوے
ہاں شمعِ زماں مطلعِ انوار دکھاوے
ہاں طبعِ رواں قلزمِ ذخار دکھاوے
ہاں رنگِ سخن گلشنِ بے خار دکھاوے
گلزار معانی کا، مہکتا نظر آئے
طوطی چمنستاں میں چہکتا نظر آئے

نظم دولت کا ایک بند ملاحظہ کیجئے۔

ہوں طالب تحقیق کہ دلدادۂ تعلیم
خم سامنے دولت کے ہے سب کا سرِ تسلیم
سنتے ہیں انھیں کے لیے ہے کوثر و تسنیم
یاں جو رہِ مولیٰ میں لٹاتے ہیں زر و سیم
دنیا ہی میں کچھ ذکر نہیں تازہ ہے اس کا
دربار میں اللہ کے آوازہ ہے اس کا

ایک شعر ۱۸۹۹ء کا۔

گھٹا جو جہل تو سامانِ عز و جاہ بڑھے
شعور کو جو ترقی ہوئی گناہ بڑھے

ایک شعر ۱۹۰۰ء یعنی ۱۸ سال کی عمر میں ملاحظہ ہو۔

میں یہ سمجھا ابر کے رنگین ٹکڑے دیکھ کر
تخت پریوں کا اُڑا لائی ہوا برسات کی

اندازہ ہوا کہ یقیناً آپ نے لکھنؤ کے شاعرانہ ماحول میں رہ کر شاعری میں اس تیزی سے مہارت حاصل کی کہ اتنی کم عمر میں آپ کا کلام اساتذۂ فن کے مقابل رکھا جا سکتا تھا حکیت کے مزاج میں اعلیٰ درجہ کی ظرافت بھی تھی جب آپ نے ایل ایل بی پاس کرنے کے بعد وکالت شروع کی تو شروع میں آپ کی وکالت کیسی چلی اور آپ کا کیا حال تھا آپ ہی کے ایک بند سے صاف ظاہر ہوتا ہے جو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو دفتر کا نقشہ۔

کرسی سے عیاں جنبش یک پائی ہے
میز ایسی ہے گویا کہ پڑی پائی ہے
منشی کا ہے خطرہ نہ مؤکل کا گزر
آفس بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

خواب میں جب ملک الموت مقابل آیا
دل ناشاد یہ سمجھا کہ موکل آیا

آغاز وکالت میں ہر وکیل کا حال یہی ہوتا ہے چکبست صاحب چونکہ بے انتہا ذہین واقع ہوئے تھے جلد ہی اچھے وکیل ہو گئے علمی قابلیت قومی ہمدردی کے علاوہ ان کے ذاتی صفات، ایسے تھے جنھوں نے ان کے احباب اور متعلقین کے دلوں کو تسخیر کر لیا تھا ان کا اخلاق ان کے مزاج کی سادگی وغیرہ ان کے ملنے والوں پر جادو کا اثر رکھتی تھی۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ صحیح ریفارم سچائی سے ہوتا ہے۔ اخلاقی معیار کو بڑھانا اور باطن کی اصلاح کو وہ ترقی سمجھتے تھے۔ مغربی شان اور نمائش سے اُن کو کوئی کشش نہ تھی۔ بلکہ ان کو نفرت سی تھی ذیل میں پھول مالا کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن سے ان کی طبیعت کا رجحان اور جذبات کا پتہ چلتا ہے۔

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں
ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنے سجانا ہرگز
نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے
خاک میں غیرت قومی نہ ملانا ہرگز

رُخ سے پردے کو اُٹھایا تو بہت خوب کیا
پردۂ شرم کو دل سے نہ اُٹھانا ہرگز
خاک میں دفن ہیں مذہب کے پرانے پاکھنڈ
تم یہ سوتے ہوئے فتنے نہ جگانا ہرگز
کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو
دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز
نغمۂ قوم کی لے جس میں سما ہی نہ سکے
راگ ایسا نہ کوئی اُن کو سنانا ہرگز

اسی سلسلہ میں انھوں نے شراب پر جو فرمایا ہے اس کے چند شعر نمونہ کی طریقہ سے پیش کیے جا رہے ہیں۔

رفیق اس کی ہے مستی عدو شعور اُس کا
وداعِ ہوش کا ساماں ہے ظہور اُس کا
خمارِ مرگ جو لائے وہ ہے سرور اس کا
سیاہ قلب کو کر دے جو ہے وہ نور اس کا
لگائے آگ کلیجے میں جو وہ آب ہے یہ
کرے جو طرفہ قیامت وہ آفتاب ہے یہ

زماں کے واسطے گو رشک انگبیں ہے یہ
مگر جگر کے لیے آب آتشیں ہے یہ

چکبست کی علمی قابلیت کی آزمائش کے لیے ان کی زندگی میں کئی مواقع آئے اول تو جب انھوں نے اپنی زیر ادارت لکھنؤ سے رسالہ "صبح امید" نکالنا شروع کیا جو کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا ۱۹۰۵ء میں یعنی جب کہ عمر صرف تیئیس برس کی تھی گلزار نسیم کے مباحثہ میں جو انھوں نے اپنی علمی قابلیت کا ثبوت پیش کیا ہے وہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ یہ زمانہ چکبست مرحوم کی طالبعلمی کا تھا۔ مگر مولانا شرر کے جوابات جس خوبی اور جس قابلیت سے دیے تھے وہ ان کے مذاق سلیم کا نمونہ ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوا تھا کہ تمام اہل قلم چکبست کے ہمزبان رہے اور انھیں کو حق بجانب ٹھہرایا۔ اسی موقع پر مولانا حسرت موہانی نے فرمایا تھا کہ مسٹر چکبست نے جو جواب اردوئے معلی میں دیے ہیں۔ وہ دیکھنے کے قابل ہیں۔ اور خصوصاً سند کے اشعار بہم پہونچانے میں ان کی تلاش حیرت انگیز ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ غالباً مسٹر چکبست کے مضمون دیکھنے سے پہلے بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہوگا کہ ان کا کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا لیکن مسٹر چکبست نے جس محنت اور قابل تعریف تلاش کے ساتھ اساتذہ کے اشعار کی مثالیں اور سندیں بہم پہونچائی ہیں اس کی داد ان کے حریف کو دینا پڑے گی۔ اور اگر انصاف سے کام لیا جائے تو اکثر غلطیوں کے

الزام سے نسیم کو بری کرنا پڑے گا؟

مرزا محمد شفیع شیرازی نے اپنی یادگار تصنیف "مباحثہ گلزار نسیم" میں لکھا ہے

"انصاف ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ جناب چکبست کے قلم سے جو مضامین جناب شرر کے اعتراضات کے جواب میں شائع ہوئے ہیں۔ اُن میں پوری شان تنقید قائم ہے اور اپنے مخالفین کی شان میں ایک لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کیا ہے جو مذاق سلیم کے پایہ سے گرا ہوا ہو"

افسوس کہ ایسا ریفارمر وطن پرستوں کا ایک درخشاں ستارہ کشمیری پنڈتوں کی قابل فخر ہستی اور دنیائے شاعری کا مہر عالمتاب صرف چوالیس سال کی عمر میں کہ جس عُمر میں ایک ریفارمر اور شاعر اپنے معیار پر نہیں پہونچ پاتا ہے وہ ان تمام منزلوں کو پار کرکے ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء مطابق ۱۳۴۴ھ بمقام رائے بریلی جہاں وہ ایک مقدمہ کے سلسلہ میں تشریف لے گئے تھے یکایک یہ عارضۂ فالج چند گھنٹوں میں اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ تاریخ وفات کے لیئے بھی دوسرے کے محتاج نہ ہوئے۔ انھیں کے مشہور مصرع سے انھیں کی تاریخ وفات نکلی۔

موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

۱۳۴۴ ہجری

چکبست کا عقیدہ تھا کہ محض خیالات کو توڑ مڑور کر نظم کر دینا شاعری نہیں ہے

خیالات کی تازگی کے ساتھ زبان میں شاعرانہ لطافت اور الفاظ میں تاثیر کا جوہر ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ چکبست کے کلام میں خیالات کی بلند پروازی اور شوکت الفاظ بہت زیادہ ہے آپ کے دیوان میں جدھر نظر اُٹھا کر دیکھئے قدرتی مناظر اور مختلف جذبات کے فوٹو نظر آتے ہیں۔ واقعات کے نظم کرنے میں آپ کی قابلیت اور مشاقی مُسلّم ہے ایک چھوٹا اور معمولی واقعہ بیان کرنے کے لیے پہلو بدل بدل کر کئی کئی بند مسلسل لکھ جاتے تھے تشبیہات میں کمال حاصل تھا۔

فن شاعری میں خصوصًا غزل کے لیے محاکات اور تخئیل کا ہونا ضروری ہے چکبست کے کلام میں دونوں چیزیں حد درجہ پائی جاتی ہیں کہیں محاکات غالب اور کہیں تخئیل چکبست نے زبان اُردو کی شاعری اور انشا پردازی میں ایک عظیم الشان تغیر پیدا کیا۔ پُرانے تنگ، اور دشوار گزار رستوں کو چھوڑ کر ایک نیا انفرادی راستہ نکالا جس میں کچھ لطف ہی اور ہے غزل پر فلسفیانہ مضامین اخلاقی معیار کے ساتھ ادا کرنا چکبست کا بہترین اور قابل قدر کارنامہ ہے ان کا کلام نئے خیالات کا آئینہ اور ان کی زبان عام جذبات کی ترجمان ہے۔

اشعار ملاحظہ ہوں۔

وطن کے عشق کا بُت بے نقاب نکلا ہے
نئے اُفق پہ نیا آفتاب نکلا ہے

عمر یوں علم کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
اک تجارت ہے کہ دن رات چلی جاتی ہے

ظاہری حسن و لیاقت کے یہ دیوانے ہیں
شمع دیکھی نہیں فانوس کے پروانے ہیں

کاہش تن سے طبیعت کی جلا کم نہ ہوئی
روشنی شمع کے گھلنے سے ذرا کم نہ ہوئی

جذبۂ شوق کی تاثیر دکھا دیتے ہیں
ہم وہ پیاسے ہیں کہ دریا کو بلا لیتے ہیں

عاشقوں کا اور رندوں کا ہجوم عام ہے
ہے گنہگاروں کا میلہ حشر جس کا نام ہے

کیا کوپلیں دکھاتی ہیں عالم اُبھار کا
آنچل سرک گیا ہے عروس بہار کا

تشنۂ شوق کو موسیٰ کی نظر ہے درکار
ورنہ دنیا میں تجلّی نہیں یا طور نہیں

دنیا سے لے چلا ہے جو تو حسرتوں کا بوجھ
کافی نہیں ہے سر پہ گناہوں کا بار کیا

راحت طلب کو درد کی لذت نہیں نصیب
تلوؤں میں آبلے جو نہیں لطف خار کیا

ہر اک خشت کہن افسانۂ دیرینہ کہتی ہے
زبان حال سے ٹوٹے کھنڈر فریاد کرتے ہیں

چمکتا ہے شہیدوں کا لہو قدرت کے پردے میں
شفق کا حسن کیا ہے، پھول کی رنگیں قبا کیا ہے

نکلی نہ صدا ایسی مغنی کے گلو سے
آتی ہے جو آوازِ ترنم لب جو سے

فصل گل میں عشقِ گل فصلِ خزاں میں یادِ گل
میں اسیرِ الفتِ نیرنگِ گلشن ہو گیا

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ چکبست کے کلام میں لطافت زبان بحد درجہ پائی جاتی ہے ذیل کے کچھ اشعار ان کی لطیف طبیعت رچا ہو انداق اور آرٹ کے ذوق کے آئینہ دار ہیں ان اشعار میں چکبست نے اپنی فنکاری اور جودت طبع کے ماتحت وہ انوکھا اور دل خوش کن رنگ پیش کیا ہے جو ان کے ہم عصروں کے کلام میں نہیں پایا جاتا اور طبیعت کو بار بار ان کلام کے پڑھنے پر سیری نہیں ہوتی۔

جان سے شوق نمائش میں گزر جائیں ابھی
قبر چاندی کی جو مل جائے تو مر جائیں ابھی

لب و لہجہ میں لگاوٹ ہے طرحداری ہے
اک فقط رنگ پہ قابو نہیں لاچاری ہے

ہو گیا ہے جو ذرا چار رکعتا ہوں پہ عبور
تو غضب کی ہمہ دانی ہے قیامت کا غرور

یوں ہوا کرتے ہیں یارانِ کہن دل سے جدا
جیسے پتوں سے گرا دیتی ہے پانی کو ہوا

یہاں تسبیح کا حلقہ وہاں زنار کا پھندا
اسیری لازمی ہے مذہب شیخ و برہمن میں

شباب آیا ہے پیدا رنگ ہے رخسار نازک سے
فروغ حسن کہتا ہے سحر ہوتی ہے گلشن میں

دیکھنا ہے حسن کے جلوے تو بت خانے میں آ
تیرے کعبے میں تو واعظ بس خدا کا نام ہے

قصے لکھے ہوئے ہیں جو فرہاد و قیس کے
گھولے ہوئے ورق وہ مری داستاں کے ہیں

بلائے جاں ہے یہ تسبیح اور زنار کے پھندے
دل حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں

آجکل مہر و وفا بھی ہے تجارت کی ادا
کوئی بیکس کا نہیں دوست بجز ذاتِ خدا

نہیں ہوتا ہے محتاج نمائش فیض شبنم کا
اندھیری رات میں موتی لُٹا جاتی ہے گلشن میں

اُترے ہیں صحن باغ میں پھولوں کے قافلے
نظریں دکھا رہی ہے عروس بہار کو

کچھ داغ گناہوں کے ہیں کچھ اشک ندامت
عبرت کا مرقع ہے مرے دامن تر میں!

طلوع صبح کیا ہے۔ مرثیہ ہے رونق شب کا
اُڑا ہے رنگ رُخ مہتاب کا نور سحر ہو کر

چکبست کا اعلیٰ درجہ کا مزاج اور ذہن ان کی شاعری میں ہر جگہ سرگرم کار ہے جس مضمون کو جس طرح مناسب سمجھتے ہیں۔ شکوہ الفاظ کے ساتھ اور اعلیٰ درجہ کے معیار بیان پر ادا کر دیتے ہیں لیکن دامن خودداری، بلند بینی اور اپنی اعلیٰ معاشرت کا رکھ رکھاؤ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ فکر طبیعت ان کے مزاج کا ایک

نمایاں عنصر بن گیا ہو جو حسب ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہو۔

نہ بدلی ہو نہ بدلے گی ترنگ اپنی طبیعت کی

دکھائے گا کہاں تک آسماں نیرنگیاں اپنی

لے اُڑے دل کو طبیعت کی روانی وہ ہے

بے پیے نشہ رہے جس میں جوانی وہ ہے

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں

مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

آپ معشوق ہیں قاتل نہیں جلاد نہیں

دل دکھانے کے لیے حُسنِ خداداد نہیں

ہو گیا ہوں ساری دنیا کے گناہوں میں شریک

جب سے میں نے یہ سُنا ہو اُن کی رحمت عام ہو

غنچے عدم سے آئے ہیں پہنے ہوئے کفن

انجام ہو نظر میں دُو روزہ بہار کا

آبرو کیا ہو تمنا و وفا میں مرنا

دین کیا ہو کسی کامل کی پرستش کرنا!

خاموشی میں یاں رہتا ہے تسخیر کا عالم
میرے لبِ خاموش پہ افسانہ ہے میرا

بد بھاری منزلِ ہستی سے کمی بے اعتنائی سے
تنِ خاکی کو شائد روح نے گردِ سفر جانا

اعمال کا طلسم ہے نیرنگِ زندگی
تقدیر کیا ہے گردشِ لیل و نہار کیا

انساں کے بغض و جہل سے دنیا تباہ ہے
طوفاں اُٹھا رہا ہے یہ مُشتِ غبار کیا

پہلو میں کسی کے دل دیوانہ نہیں ہے
ہیں مرد مگر ہمت مردانہ نہیں ہے

زر آپ نہیں دشمنِ اخلاق و ادب ہے
جو حد سے گزر جاتی ہے وہ اس کی طلب ہے

جو خود نہیں سرگرم کرے گا وہ بشر کیا
جب دل میں نہیں درد زباں میں ہو اثر کیا

یوں تو شاعر فطرتاً حساس ہوتا ہے لیکن حکیمت کے یہاں شدتِ احساس کے ساتھ قوتِ ادراک بھی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ عالم سوز گار سے متاثر ہونے

کے ساتھ ساتھ اس کا مردانہ وار مقابلہ بھی کرتے تھے اور اُن کی عالی ہمتی غالب رہتی تھی۔ ملاحظہ ہو۔

سمجھ لیا کہ ہمیں رنج و درد سہنا ہے
مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے
ڈگے نہ پاؤں محبت کے نوک خنجر پر
لہو کی مُہر ہے اپنی وفا کے محضر پر
بُلبُل کی طرح شور مچاتے ہیں رات دن
جو آشنائے لذّتِ دردِ نہاں نہیں

چکبست ایسے خود بین و خود پسند اور ایسے خود دار تھے کہ بندگی میں بھی آزادی کو برقرار رکھتے تھے۔ جس کا موجب ان کا خاندانی ماحول اُن کی عُلو ہمتی اور گرد و پیش کے حالات تھے سب سے زیادہ دخل اُن کی اس روش میں ان کی آزادانہ طبیعت اور عالی حوصلگی کا تھا۔

رنج و راحت کا سبب دنیا میں کچھ پایا نہیں
حشر میں ہم صاف کہدینگے خدا کے سامنے
رہتے ہیں سدا فکر میں عقبیٰ کی گرفتار
دنیا کے فرائض سے نہیں ان کو سروکار

کچھ طلسم آفرینش کا نہیں کھلتا مآل
پیر گردوں کے ستم سے مجھ کو حیرت ہی کمال
ہیں نظام فکر میں کچھ مصلحت پاتا نہیں
اس سمندر کا مجھے ساحل نظر آتا نہیں

ہمارے اور زاہدوں کے مذہب میں فرق اگر ہی تو اس قدر ہی
کہیں گے ہم جس کو پاس انساں وہ اُس کو خوف خدا کہیں گے

اہل بنیش کو تو ہستی میں خدا کی شک ہی
اُن پہ حیرت ہی جو بندے کو خدا کہتے ہیں

بجی کبھی یہ قناعت ہی لوں نہیں پیتے
پلانے والا پلاتا ہی کیوں نہیں پیتے

محبت ہے مجھے کوئل کے درد انگیز نالوں سے
چمن میں جا کے میں پھولوں کا شیدا ہو نہیں سکتا

منزل عیش مجھے گوشۂ گمنامی ہی
دل وہ یوسف ہی جسے فکر خریدار نہیں

ادب آموز ہی ہر ایک ذرہ اپنی وادی کا
نہیں ممکن کہ گرد اُڑ کر پڑے رہرو کے دامن پر

نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

یاں طعنہ و تشنیع کی پروا نہیں مجھ کو
تحسین و ستائش کی تمنا نہیں مجھ کو
نیرنگیٔ افلاک کا شکوا نہیں مجھ کو
کچھ فکر ہو شہرت کی یہ سودا نہیں مجھ کو
ڈوبا ہوا ہوں مثل سخن رنگ سخن میں
گُل ہو کے میں رہتا ہوں لطافت کے چمن میں

اس سلسلہ میں اُن کی عالی حوصلگی اور اقتدار پرستی سے احتراز اُن کی ایک ظریفانہ نظم جو لارڈ کرزن وائسرائے ہند کے مقابلہ میں کہی گئی تھی حقیقت کو آئینہ دار کرتی ہے۔ جس کو یہاں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ شب تار میں تاروں کا فلک پر جگمٹ
چھپ گیا آنکھ سے بدلی جو زمیں نے کروٹ
دیکھنا شرق میں وہ صبح کا تارا چمکا
وہ عروس سحر نور نے اُلٹا گھونگھٹ
بڑھ کے رضواں نے وہ جنت کے دریچے کھولے
آئی وہ گلشن فردوس سے پھولوں کی لپٹ

چونک اُٹھا پیرِ فلک بانگ لگائی ایسی!

مُرغ نے گربۂ مسکیں کی جو پائی آہٹ

آئے ہیں آپ تو کچھ حضرت کرزن سُنیئے

آپ اگر مُنھ کے کڑے ہیں تو ہوں میں بھی مُنھ پھٹ

آگیا طیش مجھے دل کا نکالوں گا غُبار

صاف کہتا ہوں نہیں بات میں اپنی ہنوٹ

خوب بوچھار ہوئی چار طرف سے تجھ پر

پائنیر کو بھی نہ خوش آئی تری ریٹ ریٹ

تاج وقعت کا اُٹھا سر سے ترے چلتے وقت

بے چراغ آئے نظر صبح کو جیسے ڈیوٹ

یاالٰہی یہ چلی بادِ مخالف کیسی

آگیا اُڑ کے جو لندن سے یہ کوڑا کرکٹ

ہیں مگر ملک میں دو چار تہمتن یاں بھی

دستیں تیرے مقابل میں جو لیتے ہیں اُلٹ

یاد رکھ حشر تلک بھی نہ تجھے بھولے گی

گوکھلے کی وہ چپھاڑ اور مہتا کی ڈپٹ

اب بھی آ ہوش میں انداز حکومت کو بدل
مرد ہو کر تجھے واجب نہیں یہ تھراہٹ
بیٹھ کر کرسیٔ وزارت پہ سنبھل کر پیارے
آہِ مظلوم نے شاہوں کے دیئے تخت الٹ

اے عروس سخن اللہ رے جوبن تیرا
لاٹ صاحب کو بھی ناتھے ہو تری زلف کی لٹ

چکبست پامال راہ میں چلنا اپنی توہین سمجھتے تھے ان کی زبان بیان وفکر
میں ایک نئی کیفیت ہے ہر سمت انھوں نے ایک نیا راستہ پیدا کیا ہے۔

ہم جہاں ہیں انجمن کی وضع اپنے ساتھ ہے
جس جگہ بیٹھے وہیں عالم تماشاں ہو گیا

زندگی یوں تو فقط بازیٔ طفلانہ ہے
مرد ہے جو کہ کسی رنگ میں دیوانہ ہے

عاشق بھی ہیں معشوق بھی یہ طرفہ مزا ہے
دیوانہ ہوں میں جس کا وہ دیوانہ ہے میرا

نفاق گبر و مسلماں کا یوں مٹا آخر
یہ بت کو بھول گئے وہ خدا کو بھول گئے

عقل کیا چیز ہے یہ وضع کی پابندی ہے
دل کو مدّت ہوئی اس قید سے آزاد کیا

شہرتِ خاص کا طالب جو ہو انساں ہو وہی
ورنہ شیطاں سے زیادہ کوئی مشہور نہیں

دل صورتِ آئینہ جو روشن نہیں ہوتا
زنّار پہننے سے برہمن نہیں ہوتا!

محبت میں بنا لیتے ہیں اپنا دوست دشمن کو
جھکاتی ہے ہماری عاجزی سرکش کی گردن کو

چکبست نے کہیں کہیں غزل سے نوحہ گری کر کے مرثیہ کا کام لیا ہے۔

باغباں نے یہ انوکھا ستم ایجاد کیا
آشیاں پھونک کے پانی کو بہت یاد کیا

عدم سے آئے تھے دنیا میں کیا معلوم تھا ہم کو
رہے گا نشۂ سودا زندگی کا دردِ سر ہو کر

آتشِ شمع ہی کا نور ہے آنکھوں کے آگے
دل وہ جو آگ چھپائے ہوئے پروانہ ہے

افسردہ خاطران چمن کو خبر نہیں
آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا

دار سونی ہو فقط نعرہ زنی باقی ہو
مست و مجذوب ہیں لاکھوں کوئی منصور نہیں

خلعت کفن کا ہم تو زمانہ سے لے چکے
اب اے عروس مرگ تجھے انتظار کیا

دل ناشاد روتا ہو زباں اُف کر نہیں سکتی
کوئی سُنتا نہیں یوں بے نوا فریاد کرتے ہیں

ہجوم بیکسی ہو شام تنہائی ہو اور میں ہوں
صدائے چارہ گر برہم نہ کردے یہ سماں میرا

مُلک میں دولت نہیں باقی دعا کے واسطے
ہاتھ خالی رہ گئے ہیں اب دُعا کے واسطے

زندگی نام ہی جس کا اُسے کھو بیٹھے ہیں
اب اُمیدوں کی فقط جلوہ گری باقی ہو

چکبست پابندی رسوم وقیود سے آزاد ہونے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے

ملاحظہ ہو۔

کیا ہے فاش پردہ کفر و دیں کا اس قدر مَیں نے
کہ دشمن ہے برہمن اور عدو شیخ حرم میرا

دردِ دل، پاسِ وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

جناب شیخ کو یہ مشق ہے یادِ الٰہی کی
خبر ہوتی نہیں دل کو زباں سے یاد کرتے ہیں

ہائے اس دنیا کی پابندی عجب دلگیر ہے
خود پہنتا ہے جسے انساں یہ وہ زنجیر ہے

نام مردوں کا ازل سے ہے ابد تک زندہ
لوگ دنیا کو عبث دار فنا کہتے ہیں!

چکبست کی عنا پسندی ان کو دنیا والوں سے بے نیاز اور فراز سے گریزاں ہونا سکھاتی ہے۔ سُنیئے

خود ہی مٹا کے جوہر ایمان و آبرو
ہم کوستے ہیں گردشِ لیل و نہار کو

نظر آتا ہے فقیری میں تماشائے جہاں
ٹھیکرا بھیک کا جمشید کا پیمانہ ہے

دوشِ صبا پہ رہتا ہوں مانند مُرغِ بو
شاخِ شجر کو بار مرا آشیاں نہیں

چکبستؔ متوازم اور تندرست ذہن کے مالک ہیں۔ اس لیے مُصیبت
کے سخت سے سخت وار بھی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

تو نظر بند ہے جلوہ ہے ترا ہر گھر میں
شمع فانوس میں ہے نور ہے محفل بھر میں

ہو یہ صورت سے عیاں عاشقِ آزادی ہیں
قفل ہے جن کی زباں پہ یہ وہ فریادی ہیں

جس کا اقبالؔ زمانہ میں چمک جاتا ہے
اُس کو بچپن کے رفیقوں سے حجاب آتا ہے

اسیرِ ضبط ہو کر تنگ ہے مُنھ میں زباں اپنی
رگِ گردن سے نکلی ہے لہو بن کر فغاں اپنی

فنا نہ ہو گئے آزاد دشمن کی بُرائی کے
لگے وہ زخم دل پر دوستوں کی بے وفائی کے

جہاں میں رہ کے یوں قائم ہوں اپنی بے ثباتی پہ
کہ جیسے عکسِ گُل رہتا ہے آبِ جوئے گلشن میں

اس کو ناقدریٔ عالم کا صلہ کہتے ہیں
مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

زندگی تلخیٔ ایام کا افسانہ ہے
زہر بھرنے کے لیے عمر کا پیمانہ ہے

وہ دن گئے کہ تجھ سے لرزتے تھے اے اجل
اب زندگی ہے نام ترے انتظار کا

سبق عمرِ رواں کا دل نشیں ہونے نہیں پاتا
ہمیشہ بھولتے جاتے ہیں جو کچھ یاد کرتے ہیں

سیکڑوں پھول کھلے پر نہ کلی دل کی کھلی
ہم قفس میں نہیں شرمندۂ تاثیرِ بہار

مرے احباب یقیں آتے ہیں مجھ سے بیوفائی سے
وفاداری میں شاید کر رہے ہیں امتحاں میرا

کیا دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا بدل گئی
واللہ وہ زمیں نہیں وہ آسماں نہیں

چکبست صاحب کی عالی ہمتی ملاحظہ فرمایئے۔

پاک ہے جوشِ سخن خوف کی تدبیروں سے

دلولے روح کے آزاد ہیں زنجیروں سے

اُٹھیں گے خاک کے تودوں سے دستگیر اپنے

زمینِ ہند کی اُگلے گی سورما بیر اپنے

آ کے میدانِ ترقی میں پلٹنے کے نہیں

یہ قدم وہ ہیں جو بڑھ جائیں تو ہٹنے کے نہیں

کیوں ڈراتے ہیں عبث گبر و مسلماں مجھ کو

کیا مٹائے گی بھلا گردشِ دوراں مجھ کو

چکبست کی شخصیت مذہبی اور اخلاقی سہاروں کے بجائے انسانی سہارے

ڈھونڈھتی ہے۔ کہتے ہیں۔

کچھ بڑی بات نہیں فاضلِ دوراں ہونا

آدمی کے لیے معراج ہے انساں ہونا

تیری خدمت سے ہو احباب کی مشکل آساں

دین تیرا تھا یہی اور یہی تھا ایماں

نہ دولت یاد آتی ہے نہ غم ہوتا ہے ثروت کا

جسے روتی ہے دنیا وہ ہے جوہر آدمیت کا

خدمت انساں نیاز کبریا ہوتی رہی
دل کے آئینہ پہ مذہب کی جلا ہوتی رہی

جس گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی
کعبہ ہے وہی اور وہی بُت خانہ ہے میرا

خدمت انساں سے دل کو آشنا کرتے رہے
دل کے آئینہ پہ اُلفت کی جلا کرتے رہے

یا خوف خدا یا خوفِ قضا ہیں دو ہی بیاں تیرے واعظ
اللہ کے بندے دل میں ترے ہے سوز و گداز محبت بھی

چکبست جدت پسند ہیں اور ساز زندگی کے ہر تار پہ ایک نغمہ ہیں

فریب زندگی جس نے نہ دیکھا ہو مجھے دیکھے
نہ سینے میں ہے دل اپنا نہ مُنھ میں ہے زباں اپنی

کھڑی تھیں راستہ روکے ہوئے لاکھوں تمنّائیں
شہید یاس ہوں نکلا ہے کس مشکل سے دم میرا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب!
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

گھٹا جو جہل تو سامانِ عِشرت و جاہ بڑھے
شعُور کو جو ترقی ہوئی گُناہ بڑھے
دُنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سفید
اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی امید

چکبست نے ادب سے انسان کا رشتہ جوڑا اور انسان کی عظمت کا راز واضح کر دیا۔ فرماتے ہیں۔

دلِ احباب میں گھر ہے شگفتہ رہتی ہے خاطر
یہی جنت ہے میری اور یہی باغِ ارم میرا
دردِ اُلفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے
خاک کے پُتلے اسی جوہر سے انساں ہو گئے
صفائے قلب سے اللہ رے انساں کی عظمت
فرشتے چُومتے ہیں آکے سنگِ آستاں میرا

چکبست رجائیت پسند تھے لیکن ان کے تلخ تجربوں نے اُن کی ہنسی کو زہر قند میں اور نشاط کو ایک طنز بھرے پندار میں بدل دیا غمِ روزگار اور حالات نے اتنا متاثر کیا کہ ان کی زندگی میں ایک گھٹن پیدا ہو گئی۔

زباں ہے بند قلم کو پنہائی ہے زنجیر
بیانِ درد کی باقی نہیں کوئی تدبیر
ہے دل میں درد مگر طاقت کلام نہیں
لگے ہیں زخم تڑپنے کا انتظام نہیں

اگر دلوں میں نہیں آب جوشِ غیرت کا
تو پڑھ دو فاتحہ قومی وقار و عزّت کا
وفا کو پھونک دو ماتم کرو محبت کا
جنازہ لے کے چلو قوم و دین و ملّت کا

نشاں مٹا دو امنگوں کا اور ارادوں کا
لہو میں غرق سفینہ کرو مرادوں کا!
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

زمانے کی محبت پر نہ ہو لے ہم نشیں نازاں
سنائیں گے تجھے فرصت میں قصے آشنائی کے
کیا کہیں کس سے کہیں دنیا میں کیا کرتے رہے
بد عتیں ہوتی رہیں شکرِ خدا کرتے رہے

شہید یاس ہوں رسوا ہوں ناکامی کے ہاتھوں سے
جگر کا چاک بڑھ کر آ گیا ہے میرے دامن میں

ازل کے دن مٹا دینا تھا اس مٹی کی صورت کو
جگائے جس نے فتنہ آفرینش کے بشر ہو کر

یہ غلط ہے کہ ہمیں طرزِ فغاں یاد نہیں
اب وہ عالم ہے کہ گنجائشِ نشتر یاد نہیں

یاد احباب گذشتہ پہ فدا رہتا ہے
دلِ ناشاد کبھی شمع کا پروانہ ہے

پھیلی ہے جیسے گورِ غریباں میں چاندنی
عالم یہ ہے خوشی میں دلِ داغدار کا

مفلسی میری محبت کی کسوٹی بن گئی
ہمت احباب کے جوہر نمایاں ہو گئے

چکبست کی آہ ہمیں ایک گہری حقیقت کی طرف لے جاتی اور یہاں وہ شاعر نہیں بلکہ فلسفی نظر آتے ہیں اور زندگی کے لیے ایک پیغام سناتے ہیں فرماتے ہیں۔

اُن پہ حسرت ہی جو یوں دیتے ہیں غم گینوں کو دم
خواب ہے دُنیا ہی یاں کیسی خوشی کیسا الم!

انتظامِ دہر میں آخر ہی پھر تدبیر کیا
خواب دنیا ہی تو ہی اس خواب کی تعبیر کیا

جس جا ہو خوشی ہی وہ مجھے منزلِ رحمت
جس گھر میں ہو ماتم وہ عزاخانہ ہی میرا

میں دوست بھی اپنا ہوں عدو بھی ہوں میں اپنا
اپنا ہی کوئی اور نہ بیگانہ ہی میرا

جہاں میں آنکھ جو کھولی فنا کو بھول گئے
کچھ ابتدا ہی سے ہم انتہا کو بھول گئے

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہی خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

کشاکش ہی امید و یاس کی یہ زندگی کیا ہی
الٰہی ایسی ہستی سے تو ہی اچھا عدم میرا

جس پہ احباب بہت روئے فقط اتنا تھا
گھر کو ویران کیا قبر کو آباد کیا

راحت سے بھی عزیز ہی رحت کی آرزو
دل ڈھونڈھتا ہے سلسلۂ انتظار کو!
شب کو بہار پردۂ شبنم میں رہ گئی
انجام سوچ کر حسن روزگار کا
اک سلسلہ ہوس کا ہی انساں کی زندگی!
اس ایک مُشتِ خاک کو غم دو جہاں کے ہیں
زندگی میری اسیری کی فقط تمہید ہے
دام میں دانے مری قسمت کے پنہاں ہوگئے

چکبست اس درجہ وطن پرست تھے کہ اُن کا قول تھا جس انسان میں وطن پرستی کا مادہ نہیں وہ درجۂ انسانیت سے گرا ہوا ہی۔ ذیل کے کچھ اشعار اُن کے قومی شاعر ہونے کا پورا پورا ثبوت دیں گے۔

کرشمہ یہ بھی ہی اے بے خبر افلاس قومی کا
تلاشِ رزق میں اہلِ ہُنر کا دربدر جانا
یہاں کی خاک ہم کو کیمیا ہے
یہ سونے سے بھی قیمت میں سوا ہی

وطن کا جن بزرگوں سے ہوا نام
اسی مٹی میں وہ کرتے ہیں آرام
مست ہوں حُبِ وطن سے کوئی مئےخوار نہیں
مجھ کو نغمہ کی نُمائش سے سروکار نہیں
اگر ہو مرد نہ یوں عمر رائیگاں کاٹو
غریب قوم کے پیروں کی بیڑیاں کاٹو
لوگ کہتے ہیں کہ یہ شان عبادت کیا ہے
خدمت قوم نہیں ہے تو ریاضت کیا ہے
جذبۂ شوق سے خالی نہ ہو سودائے شباب
وہ جوانی ہے جو اس شوق میں برباد رہے
یہ کیسی بزم ہے اور کیسے یہ ساقی ہیں
شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے
غرورِ جہل نے ہندوستاں کو لوٹ لیا
بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں
دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہو چمک تاروں کی!

زباں سے جوشِ قومی دل میں پیدا ہو نہیں سکتا
اُبلنے سے کنواں وسعت میں دریا ہو نہیں سکتا

زباں کے زور پہ ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل
وطن میں ایک دل ہوتا مگر دردآشنا ہوتا

وطن کی خاک سے مرکر بھی ہم کو اُنس باقی ہے
مزا دامانِ مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

بشر کا دل وہ نہیں سنگ و خشت ہے واللہ
کہ جس میں دردِ محبت نہ ہو وطن کے لیے

ہم پوجتے ہیں باغِ وطن کی بہار کو
آنکھوں میں اپنی پھول سمجھتے ہیں خار کو

وطن میں بے وطن مجھ کو کیا ہے اک فسونگر نے
نہ میں ہندوستاں کا ہوں نہ ہے ہندوستاں میرا

اسی سلسلے نظم "خاک ہند" کے چند بند بھی ملاحظہ ہوں۔

اسی خاک دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری

سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب خوباں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک
رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک
ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا
آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرہ اس منزلِ کہن کا
تلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا تمن کو
اکبر نے جامِ اُلفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب سُور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں
کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں
پستی سی آگئی ہے پیروں کے حوصلوں میں
گُل شمعِ انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حُبِّ وطن نہیں ہے، خاکِ وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا
دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا
اک لاشِ بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال اپنے برباد ہو رہے ہیں

عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

ذیل میں چند بند ان کی نظم "ہوم رول" کے پیش کیے جاتے ہیں جن سے ان کے جذبات و تاثرات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

وطن پرست شہیدوں کی خاک لائیں گے

ہم اپنی آنکھ کا سُرمہ اسے بنائیں گے

غریب ماں کے لیے درد و دُکھ اٹھائیں گے

یہی پیام وفا قوم کو سُنائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھُول کے بدلے

نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رُول کے بدلے

بسے ہوئے ہیں محبت سے جن کی قوم کے گھر

وطن کا پاس ہے ان کو سُہاگ سے بڑھ کر

جو شیر خوار ہیں ہندوستاں کے لخت جگر

یہ ماں کے دودھ سے لکھا ہے ان کے سینہ پر

طلب فضُول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے

نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

زباں کو بند کیا ہے یہ غافلوں کو ہے ناز
ذرا رگوں میں لہو کا بھی دیکھ لیں انداز

رہے گا جان کے ہمراہ دل کا سوز و گداز
چتا سے آئے گی مرنے کے بعد یہ آواز

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رُول کے بدلے

چکبستؔ انتہائی وطن پرست تھے۔ اکثر معاملات میں محبان وطن اور قومی لیڈروں سے اختلاف ہو جایا کرتا تھا۔ وہ سچی آزادی اور حقیقی بہبودی کے دلدادہ تھے سطحی چیزوں سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا ذیل کے چند اشعار سے ان کا اصل رجحان اور اصل مقصد آزادی نمایاں ہوتا ہے۔

رہنمائی کس کی ہوگی مجھ کو حیرت ہے یہی
قافلہ میں قوم کے سب پیشوا ہونے کو ہیں

ہے طلب گاروں میں غل کچھ سر اُٹھانا چاہیے
قوم کے دربار سے خلعت عطا ہونے کو ہیں

جن کو منزل سے زیادہ ہے ہوا کا رُخ عزیز
قوم کے بیڑے کے ایسے ناخدا ہونے کو ہیں

مادرِ ناشاد روتی ہے کوئی سُنتا نہیں
دل جگر سے بھائی سے بھائی جدا ہونے کو ہیں

اُن کی نظم "فریادِ قوم" کے بھی چند بند ملاحظہ ہوں۔

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندوؤ ہشیار
اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار

اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار
تو زیر موجِ فنا ہوگا آبرو کا مزار

مٹے گی قوم یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

دکھا دو جوہر اسلام اے مسلمانو
وقارِ قوم گیا قوم کے نگہبانو

ستون ملک کے ہو قدر قومیت جانو
جفا وطن پہ ہے فرض وفا کو پہچانو

نبیؐ کے خلق و مروت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شانِ حمیت کے یادگار ہو تم

کرو خیال کچھ اسلاف کی حمیت کا!
دیا تھا دشمن قاتل کو جام شربت کا

معاملہ ہے یہاں بھائیوں کی عزّت کا
یہ فرض عین ہے سودا نہیں مروّت کا

اگر نہ اب بھی ہو اسلام کا جگر پانی
ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

رہے گا مال نہ ہمراہ جائے گی دولت
گئی تو قبر تلک ساتھ جائے گی ذلّت

کرو جو ایک روپے سے بھی قوم کی خدمت
تمہاری ذات سے ہے اک یتیم کو راحت

ملے حجاب کی چادر کسی کی عصمت کو
کفن نصیب ہو شاید کسی کی میت کو

مٹا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے
نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے

لگا دے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے
نہ جوش کھائے جو غیرت سے وہ لہو کیا ہے

فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

جہاں تک اساتذہ کی اتباع کا تعلق ہے چکبست نے اس خوبی سے ان کے رنگ کو اپنایا ہے کہ بسا اوقات یہ امتیاز مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ اشعار چکبست کے ہیں یا اپنے رنگ کے موجد اُستاد کے، اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ میر انیس مرحوم کے کلام اور اُن کی منظر نگاری سے چکبست کو ایک خاص لگاؤ تھا اور ان کی فنکاری اور اُستادی سے بے حد متاثر تھے ان کی اتباع میں پنڈت جی نے "راماین کا سین" اس انداز اور ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس نے پردیس کے سفر کے وقت کا حقیقی منظر اپنے الفاظ اور اپنے احساس کے ساتھ خداداد قوت بیان میں پیش کیا ہے ہنگامی بیکسی، دلی میں جذبات کا اُمنڈتا ہوا بحر بیکراں، محبت قلبی، ہندوستان کا ماحول، ہم سے پہلوں کی معاشرت۔ تہذیب، بات کی پچ، قول پر مردانگی کے ساتھ عمل اور ہندوستان کی بے نظیر تاریخ کا پرتو حقیقتاً اس انداز سے پیش کیا ہے کہ سوائے میر انیس کے اور کسی دوسرے شاعر کے کلام میں اس کی مثال ملنا قطعی ناممکن ہے۔ ذیل میں کچھ بند نمونتاً پیش کئے جاتے ہیں۔

(راجہ رامچندر جی کا ماں باپ سے رخصت ہونا)

رخصت ہوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام　　راہ وفا کی منزل اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام　　دامن کے اشک پوچھ کے دل سے کیا کلام

اظہار بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال　　خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال　　سکتہ سا ہوگیا ہے یہ ہے شدت ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ　　نور نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ　　لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ

چہرے کا رنگ حالت دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیر یاس کا قفل دہن کھلا　　افسانۂ شدائد رنج و محن کھلا
اک دفتر مظالم چرخ کہن کھلا　　وا تھا دہان زخم کہ باب سخن کھلا

درد دل غریب جو صرف بیاں ہوا
خون جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں — میں جانتی ہوں جس لیے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو جاؤ لال — لیکن میں اپنے منھ سے نہ ہرگز کہونگی ہاں
کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سفید — اندھا کیے ہوئے ہے زر و مال کی امید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید — سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثال بید
لکھی ہے کیا حیات ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر — گھر جن کے بے چراغ رہے ہونگے عمر بھر
رہتا مرا بھی نخل تمنا جو بے اثر — یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغ تمنا اجڑ گیا

سن کر زباں سے ماں کی یہ فریاد درد خیز — اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز — لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز

سوچا یہی کہ جان سے بیکس گزر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادر ناشاد کے حضور | مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
صدمہ یہ شاق عالم پیری میں ہے ضرور | لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دور

شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

پڑتا ہے جب غریب پہ رنج و محن کا بار | کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہگار | یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار

انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امر رضا میں جو خم رہے

اپنی نگاہ ہے کرم کارساز پر | صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر | رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر

اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامان دشت دامن مادر سے کم نہیں

ماں کا جواب

یہ گفتگو ذرا نہ ہوئی ماں پہ کارگر ہنس کر وفور یاس سے لڑکے پہ کی نظر
چہرے پہ یوں ہنسی کا نمایاں ہوا اثر جس طرح چاندنی کا ہو شمشان میں گزر
پنہاں جو بیکسی تھی وہ چہرے پہ چھا گئی
جو دل کی مُردنی تھی نگاہوں میں آ گئی

پھر یہ کہا کہ میں نے سُنی سب یہ داستاں لاکھوں برس کی عمر ہو تم ہو بڑے گیان
لیکن جو میرے دل پہ ہوئی ہیں یہ امتحاں بچے ہو اس کا علم نہیں تم کو بے گماں
اس درد کا شریک تمہارا جگر نہیں
کچھ ماتا کی آنچ کی تم کو خبر نہیں

ان آنسوؤں کی قدر تمہیں کچھ ابھی نہیں باتوں سے جو بجھے یہ وہ دل کی لگی نہیں
لیکن تمہیں ہو رنج یہ میری خوشی نہیں جاؤ سدھارو خوش رہو میں روکتی نہیں
دنیا میں بے حیائی سے زندہ رہوں گی میں
پالا ہے بیٹے تم کو تو دکھ بھی سہوں گی میں

طوفان آنسوؤں کا زباں سے ہوا نہ بند رک رک کے اس طرح ہوا گویا وہ دردمند
پہونچی ہے مجھ سے آپ کے دل کو اگر گزند مرنا مجھے قبول ہے جینا نہیں پسند

جو بے وفا ہو مادرِ ناشاد کے لیے
دوزخ یہ زندگی ہے اس اولاد کے لیے

بن باس پر خوشی سے جو راضی نہ ہوؤنگا میں
کس طرح منہ دکھانے کے قابل رہونگا میں
کیونکر زبانِ غیر کے طعنے سہوں گا میں
دنیا جو یہ کہے گی تو پھر کیا کہونگا میں

لڑکے تھے بے خیالی کو نقشِ جبیں کیا
کیا بے ادب تھا باپ کا کہنا نہیں کیا

تاثیر کا طلسم تھا معصوم کا خطاب
تو ماں کے دل کو چوٹ لگی سن کے یہ جواب
غم کی گھٹا سے ہٹ گئی تاریکیِ عتاب
چھاتی بھر آئی ضبط کی باقی رہی نہ تاب

سرکا کے پاؤں گود میں سر کو اٹھا لیا
سینے سے اپنے لختِ جگر کو لگا لیا

دونوں کے دل بھر آئے ہوا اور ہی سماں
گنگ و جمن کی طرح سے آنسو ہوئے رواں
ہر آنکھ کو نصیب یہ اشک وفا کہاں
ان آنسوؤں کا مول اگر ہو تو نقد جاں

ہوتی ہے اُن کی قدر فقط دل کے راج میں
ایسا گہر نہ تھا کوئی دشرت کے تاج میں

محققینِ حال نے میر انیسؔ کو اُن کی منظر نگاری اور سلاست کی بنا پر دنیا کے صفِ اوّل کے شعرا میں شمار کیا ہے۔ جب ہم حکیثیت کو میر انیسؔ کے

رنگ میں دیکھتے ہیں اور ان کی اتباع میں پورے طور پر کامیاب پاتے ہیں تو یقین ہوتا ہے کہ پنڈت جی نے اگر صرف چوالیس سال کی عمر نہ پائی ہوتی اور دوسرے اساتذہ کی طرح صبح پیری کے بھی منظر دیکھے ہوتے تو گلہائے مضامین سے کتابوں کے باب بھرے پڑے ہوتے اور صحیح طور پر محققین ان کو دنیا کے شعراء کے صفِ اول میں شمار کرتے نہ کہ خود شاعر اس کا احساس کرتا۔

ذکر کیا آئے گا بزمِ شعرا میں اپنا
میں تخلص کا بھی دنیا میں گنہگار نہیں

(چکبست)

انتخاب غزلیات از دیوان "صبحِ وطن"

غزل

دل ہی بُجھا ہوا ہو تو لطفِ بہار کیا
ساقی ہی کیا شراب ہی کیا سبزہ زار کیا

دیکھا سُرورِ بادۂ ہستی کا خاتمہ
اب دیکھیں رنگ لائے اجل کا خمار کیا

اب کی تو شامِ غم کی سیاہی کچھ اور ہی
منظور ہی تجھے مرے پروردگار کیا

جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح
اُس کے لیے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

خلعت کفن کا ہم تو زمانہ سے لے چکے
اب ہی عروسِ مرگ تجھے انتظار کیا

اعمال کا طلسم ہی نیرنگ زندگی
تقدیر کیا ہی گردشِ لیل و نہار کیا

چلتی ہی اس چمن میں ہوا انقلاب کی
شبنم کو آئے دامنِ گل میں قرار کیا

تغیّرِ حالِ زار ہی بس اک نگاہِ یاس
ہو داستان درد کا اور اختصار کیا

چھٹکی ہوئی ہی گورِ غریباں پہ چاندنی
ہی بیکسوں کو فکرِ چراغِ مزار کیا

کہتے ہیں جسے ابر وہ میخانہ ہی میرا
جو پھول کھلا باغ میں پیمانہ ہی میرا

دریا مرا آئینہ ہی لہریں مرے گیسو
اور موجِ نسیمِ سحری شانہ ہی میرا

ہر ذرّۂ خاکی ہی مرا مونس و ہمدم
دنیا جسے کہتے ہیں وہ کاشانہ ہی میرا

جس گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی
کعبہ ہی وہی اور وہی بت خانہ ہی میرا

میں دوست بھی اپنا ہوں عدو بھی اپنا
اپنا ہی کوئی اور نہ بیگانہ ہے میرا

عاشق بھی ہوں معشوق بھی یہ طرفہ مزا ہے
دیوانہ ہوں میں جس کا وہ دیوانہ ہے میرا

خاموشی میں یاں رہتا ہے تسخیر کا عالم
میرے لب خاموش پہ افسانہ ہے میرا

کہتے ہیں خودی کس کو خدا نام ہے کس کا
دنیا میں فقط جلوۂ جانانہ ہے میرا

شاعر کا سخن کم نہیں مجذوب کی بڑ سے
ہر ایک نہ سمجھے گا وہ افسانہ ہے میرا

فنا نہیں ہے محبت کی رنگ و بو کے لیے
بہار عالم فانی رہے رہے نہ رہے

جنون حب وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

جو دل میں زخم لگے ہیں وہ خود پکاریں گے
زباں کی سیف بیانی رہے رہے نہ رہے

دلوں میں آگ لگے یہ وفا کا جوہر ہے
یہ جمع خرچ زبانی رہے رہے نہ رہے

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے
ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے

دل وہ دل ہے جو سدا ضبط سے ناشاد رہے
لب وہ لب ہے جو نہ شرمندۂ فریاد رہے

تال ہے بگڑا ہوا دل کا سنبھالوں کب تک
لے کی پابند کہاں تک مری فریاد رہے

آپ سے ہم سے ہوا تھا کبھی پیمان وفا
کیجیے ظلم مگر وہ بھی گھڑی یاد رہے

مجھ کو مل جائے چہکنے کے لیے شاخ مری
کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

باغ میں لے کے جنم ہم نے اسیری جھیلی
ہم سے اچھے رہے جنگل میں جو آزاد رہے

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں — مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اس کے ساقی ہیں — شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے

یہ بیکسی بھی عجب بیکسی ہے دنیا میں — کوئی ستائے ہمیں ہم ستا نہیں سکتے

کشش وفا کی انھیں کھینچ لائی آخر کار — یہ تھا رقیب کو دعویٰ وہ آ نہیں سکتے

چراغ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے
اسے ہوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے

کبھی تھا ناز زمانے میں اپنے ہند پہ بھی — پر اب عروج وہ علم و کمال فن میں نہیں

رگوں میں خون وہی دل وہی جگر ہے وہی — وہی زباں ہے مگر وہ اثر سخن میں نہیں

وہی ہے بزم وہی شمع ہے وہی فانوس — فدائے بزم وہ پروانے انجمن میں نہیں

غرور و جہل نے ہندوستاں کو لوٹ لیا
بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں

کسے معلوم ہے کیا رنگ بدلے گی فغاں اپنی — خدا حافظ ہے دل کا بند ہوتی ہے زباں اپنی

پڑی ہیں تیر بن کر نگاہیں پاسبانوں کی — غزالان حرم بھولے ہوئے شوخیاں اپنی

گلوں نے باغ چھوڑا تنگ آ کر جور گلچیں سے — چمن ویران ہوتا ہے خبر لے باغباں اپنی

بیان درد دل پر بھی گماں ہے بد زبانی کا — ستمگر سن نہیں سکتا ہے شاید داستاں اپنی

فریب زندگی جس نے نہ دیکھا ہو مجھے دیکھے — نہ سینے میں ہے دل اپنا نہ منہ میں ہے زباں اپنی

صدا دیتا ہے یہ میرا گریباں چاک ہونے پر ہزاروں پیرہن پیدا کرینگی دھجیاں اپنی

نہ بدلی ہے نہ بدلے گی ترنگ اپنی طبیعت کی
دکھائے گا کہاں تک آسماں نیرنگیاں اپنی

گڑ گئے ہیں غم ہے ندامت سے دل آزاروں کی رہ گئی بات زمانے میں وفاداروں کی

قاضیِ وقت نے برسات میں توبہ توڑی رند آزاد ہوئے عید ہے میخواروں کی

بیگناہوں کا تو انصاف ہوا دنیا میں اب ہمیں دیکھنی ہے شرم گنہگاروں کی

دل میں ارمان ہے اس طرح سے آزادی کا
جیسے گنگا میں جھلکتی چمک تاروں کی

زباں سے جوش قومی دل میں پیدا ہو نہیں سکتا اُبلنے سے کنواں وسعت میں دریا ہو نہیں سکتا

گراں ہے جنس ادنیٰ خریداروں کی ابتر ہے اب اس بازار میں الفت کا سودا ہو نہیں سکتا

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

اُبھرنے ہی نہیں دیتی یہاں بے مائگی دل کی نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

محبت ہے مجھے کوئل کے دردانگیز نالوں سے
چمن میں جاکے میں پھولوں کا شیدا ہو نہیں سکتا

فسانہ ہو گئے آزار دشمن کی برائی کے لگے وہ زخم دل پر دوستوں کی بیوفائی کے

بردل سے بھی یہاں برتاؤ رکھے ہیں بھلائی کے بنایا باوفا اس دل کو صدقے بیوفائی کے

زمانے کی محبت پر نہ بھول اے ہم نشیں نازاں　　سنائیں گے تجھے فرصت سے قصہ آشنائی کے

یہ وہ غم ہے کہ جس کی پرورش دل خوب کرتا ہے　　زباں تک لا نہیں سکتا ہوں شکوے بے وفائی کے

جلا دی دل کو میرے قلب دشمن کی سیاہی نے

کدورت واں بڑھی کا ادھر یاں کھلے جوہر صفائی کے

اگر درد محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا　　نہ مرنے کا ستم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

ہزاروں جان دیتے ہیں بتوں کی بیوفائی پر　　اگر ان میں سے کوئی باوفا ہوتا تو کیا ہوتا

خدا کو بھول کر انسان کے دل کا یہ عالم ہے　　یہ آئینہ اگر صورت نما ہوتا تو کیا ہوتا

ہوس جینے کی یوں ہی عمر کے بیکار کٹنے پر　　جو ہم سے زندگی کا حق ادا ہوتا تو کیا ہوتا

یہ مانا بے حجابانہ نگاہیں قہر کرتی ہیں　　مگر حسن حیا پرور کا عالم دوسرا ہوتا

زباں کے زور پر ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل

وطن میں ایک دل ہوتا مگر درد آشنا ہوتا

دوستی میں اپنا اپنا حق ادا کرتے رہے　　وہ جفا کرتے رہے اور ہم وفا کرتے رہے

کیا کہیں کس سے کہیں دنیا میں کیا کرتے رہے　　نعمتیں ہوتی رہیں شکر خدا کرتے رہے

اہل ہمت منزل مقصود تک آ ہی گئے

بندۂ تقدیر قسمت سے گلا کرتے رہے

جہاں میں آنکھ جو کھولی فنا کو بھول گئے　　کچھ ابتدا ہی میں ہم انتہا کو بھول گئے

نفاقِ گبر و مسلماں کا یوں مٹا آخر
یہ بُت کو بھول گئے وہ خدا کو بھول گئے

ہوا امتزاج کا عالم یہ سیرِ یورپ سے
کہ اپنے ملک کی آب و ہوا کو بھول گئے

زمیں لرزتی ہے بہتے ہیں خون کے دریا
خودی کے جوش میں سارے خدا کو بھول گئے

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

کرشمہ یہ بھی ہے اے بے خبر افلاس قومی کا
تلاشِ رزق میں اہلِ ہنر کا دربدر جانا

یہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مر جانا

چمن زارِ محبت میں اُسی نے باغبانی کی
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

سدھاری منزلِ ہستی سے کس بے اعتنائی سے
تنِ خاکی کو شاید روح نے گردِ سفر جانا

اجل کی نیند میں بھی خوابِ ہستی گر نظر آیا
تو پھر بیکار ہے تنگ آ کے اس دنیا سے مر جانا

شجر سکتے میں ہیں خاموش ہیں بلبل نشیمن میں
سدھارا قافلہ پھولوں کا سناٹا ہے گلشن میں

گراں تھی دھوپ اور شبنم بھی جن پودوں کو گلشن میں
تری قدرت سے وہ پھولے پھلے صحرا کے دامن میں

مٹانا تھا اسے بھی جذبۂ شوقِ فنا تجھ کو
نشانِ قبرِ مجنوں داغ ہے صحرا کے دامن میں

زمانے میں نہیں اہلِ ہنر کا قدرداں باقی
نہیں تو سیکڑوں موتی ہیں اس دریا کے دامن میں

یہاں تسبیح کا حلقہ وہاں زنار کا پھندا
اسیری لازمی ہے مذہبِ شیخ و برہمن میں

دکھایا معجزہ حسنِ بشر کا دستِ قدرت نے — بھری تاثیر تصویرِ گلی کے رنگ و روغن میں

شہیدِ یاس ہوں رسوا ہوں ناکامی کے ہاتھوں سے — جگر کا چاک بڑھ کر آ گیا ہے میرے دامن میں

جہاں میں رہ کے یوں قائم ہوں اپنی بے ثباتی پر — کہ جیسے عکسِ گل رہتا ہے آبِ جوئے گلشن میں

نہیں ہوتا ہے محتاجِ نمائش فیضِ شبنم کا! — اندھیری رات میں موتی لٹا جاتی ہے گلشن میں

وطن کی خاک سے مر کر بھی ہم کو اُنس باقی ہے

مزا دامانِ مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

کشاکش ہے امید و یاس کی یہ زندگی کیا ہے — الٰہی ایسی ہستی سے تو ہے اچھا عدم میرا

گھڑی تھیں اس قدر سچے ہوئے لاکھوں تمنا میں — شہیدِ یاس ہوں نکلا ہے کس مشکل سے دم میرا

زبانِ حال سے یہ لکھنؤ کی خاک کہتی ہے — مٹایا گردشِ افلاک نے جاہ و حشم میرا

کیا ہے فاش پردہ کفر و دیں کا اس قدر میں نے — کہ دشمن ہے برہمن اور عدوِ شیخِ حرم میرا

رہی ہے ایک طرزِ آرزو کی آرزو باقی

اسی پر ختم ہے افسانۂ درد و الم میرا

باغباں نے یہ انوکھا ستم ایجاد کیا — آشیاں پھونک کے پانی کو بہت یاد کیا

جس پہ احباب بہت روئے فقط اتنا تھا — گھر کو ویراں کیا قبر کو آباد کیا

عقل کیا چیز ہے اک وضع کی پابندی ہے — دل کو مدت ہوئی اس قید سے آزاد کیا

اس کو ناقدریِ عالم کا صلہ کہتے ہیں — مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

اُترے ہیں صحنِ باغ میں پھولوں کے قافلے — نظریں دکھا رہی ہیں عروسِ بہار کو

راحت سے بھی عزیز ہے راحت کی آرزو — دل ڈھونڈھتا ہے سلسلۂ انتظار کو

لایا ہے کیا پیامِ وطن پوچھتا ہوں میں — غربت میں دیکھتا ہوں جو ابرِ بہار کو

خود ہی گنوا کے جوہرِ ایمان و آبرو — ہم کوستے ہیں گردشِ لیل و نہار کو

یہ کہہ کے اُن کی بزم میں ہم بھی پہونچ گئے
کیا تھا جو آج یاد کیا خاکسار کو !

ہے شوق کی منزل یہی دنیا کے سفر میں — کیا خاک جوانی ہے جو سودا نہیں سر میں

یہ رنگِ شفق ہے کہ لہو اہلِ وفا کا — کچھ داغ نظر آتے ہیں دامانِ سحر میں

دنیا مرے نالے سے کھنچ آتی ہے قفس تک — میلہ سا لگا رہتا ہے صیاد کے گھر میں

کچھ داغ گناہوں کے ہیں کچھ اشکِ ندامت
عبرت کا مرقع ہے مرے دامنِ تر میں

نہیں منظور جینا روشناسِ چارہ گر ہو کر — رہے گا پاسِ غیرت بندۂ زخمِ جگر ہو کر

ازل کے دن مٹا دینا تھا اس مٹی کی صورت کو — جگائے جس نے فتنے آفرینش کے بشر ہو کر

عدم سے آئے تھے دنیا میں کیا معلوم تھا ہم کو — رہے گا ساتھ سودا زندگی کا دردِ سر ہو کر

طلوعِ صبح کیا ہے مرثیہ ہے رونقِ شب کا
اُڑا ہے رنگ رُخِ مہتاب کا نورِ سحر ہو کر

آپ معشوق ہیں قاتل نہیں جلاد نہیں
دل دکھانے کے لیے حسن خداداد نہیں

یہ غلط ہے کہ ہمیں طرز فغاں یاد نہیں
اب وہ عالم ہے کہ گنجائش فریاد نہیں

باغ میں جاکے مجھے اور قلق ہوتا ہے
پھول پتے بھی مرے دل کی طرح شاد نہیں

قدرداں کیوں مجھے تکلیف سخن دیتے ہیں
میں سخنور نہیں شاعر نہیں استاد نہیں

زندگی تلخی ایام کا افسانہ ہے
تو ہر بھرنے کے لیے عمر کا پیمانہ ہے

بے حجاب آ کے تری نرگس مستانہ ہے
اب جسے ہوش کا سودا ہے وہ دیوانہ ہے

نظر آتا ہے فقیری میں تماشائے جہاں
ٹھیکرا بھیک کا جمشید کا پیمانہ ہے

دل ہے مایوس کہ نیت نہیں ساقی کی درست
آنکھ کہتی ہے یہ شیشہ ہے یہ پیمانہ ہے

فکر مینا کیوں ہے ساقی کیوں ہاتھ میں جام ہے
تو لگا دے منہ سے خم پینا ہمارا کام ہے

عاشقوں کا اور رندوں کا ہجوم عام ہے
ہے گنہگاروں کا میلہ حشر جس کا نام ہے

دیکھنا ہے حسن کے جلوے تو بت خانے میں آ
تیرے کعبہ میں تو واعظ فقط خدا کا نام ہے

ہوگیا بھولا سا دل دنیا کے گناہوں میں شریک
جب سے میں نے یہ سنا ہے اس کی رحمت عام ہے

لطف شاہی کی تمنا غیر کے دل میں رہے
ہم فقیروں ہی سے زندہ لکھنؤ کا نام ہے

کفر ہے اس کی شکایت جس نے دل پیدا کیا
دل سے جو پیدا ہوئی وہ آرزو بدنام ہے

کیا کونپلیں دکھاتی ہیں عالم اُبھار کا!
آنچل سرک گیا ہے عروسِ بہار کا

افسردہ خاطران چمن کو خبر نہیں
آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا

پھیلی ہو جیسے گورِ غریباں میں چاندنی
عالم یہ ہے خوشی میں دلِ داغدار کا

وہ دل گئے کہ تجھ سے لرزتے تھے اے اجل
اب زندگی ہے نام ترے انتظار کا

غنچے عدم سے آئے ہیں پہنے ہوئے کفن

انجام ہے نظر میں دوروزہ بہار کا

جنت میں خاک بادہ پرستوں کا دل لگے
نقشے نظر میں صحبتِ پیر مغاں کے ہیں

اک سلسلہ ہوس کا ہے انساں کی زندگی
اس ایک مشتِ خاک کو غم دو جہاں کے ہیں

قصّہ لکھے ہوئے ہیں جو فرہاد و قیس کے

کھولے ہوئے ورق وہ مری داستاں کے ہیں

شورش دیر و حرم سے جب پریشاں ہو گئے
کچھ سمجھ کر ہم شریک بزم رنداں ہو گئے

مفلسی میری محبت کی کسوٹی بن گئی
ہمت احباب کے جوہر نمایاں ہو گئے

نعمتِ الفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے
خاک کے پتلے اسی جوہر سے انساں ہو گئے

حسن کی دولت سے تھے گلہائے نورس بیخبر
دیکھ کر رنگ چمن کانٹے نگہباں ہو گئے!

مے کے قطرے کیلئے تھے جب تک خم میں تھے ساغر میں تھے
میرے ہونٹوں تک پہونچا تھا کہ طوفاں ہو گئے

پڑ گئی بازارِ محشر میں گنہگاروں کی ساکھ
رحمت باری کے سکے داغ عصیاں ہو گئے

جام تک خم سے شراب آنے میں ہوجاتی ہے دیر
ہم تو ساقی کے تکلف سے پریشاں ہوگئے

طپش شوق کو موسیٰ کی نظر ہے درکار
ورنہ دنیا میں تجلّی نہیں یا طور نہیں

دار سولی ہے فقط نعرہ زنی باقی ہے
مست و مجذوب ہیں لاکھوں کوئی منصور نہیں!

شہرۂ خاص کا طالب جو ہو انساں ہے وہی
ورنہ شیطان سے زیادہ کوئی مشہور نہیں

کیوں رُلانے کو سُناتے ہو وفا کے قصّے
دوستو اب تو محبت کا یہ دستور نہیں

دل کئے تسخیر، بخشا فیض روحانی مجھے
حُبِ قومی ہو گیا نقش سلیمانی مجھے

جانچتا ہوں وسعتِ دل خانۂ غم کے لئے
امتحاں ہے رنج و حرماں کی فراوانی مجھے

ذرّہ ذرّہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

خود پرستی مِٹ گئی قدر محبت بڑھ گئی
ماتم احباب ہے تعلیم روحانی مجھے

جناب شیخ کو یہ عشق ہے یادِ الٰہی کی
خبر ہوتی نہیں دل کو زباں سے یاد کرتے ہیں

سبق عمر رواں کا دلنشیں ہونے نہیں پایا
ہمیشہ بھولتے جاتے ہیں جو کچھ یاد کرتے ہیں

نہ جانی قدر تیری عمر رفتہ ہم نے کالج میں
نکل آتے ہیں آنسو اب تجھے جب یاد کرتے ہیں

